رموزِ بیخودی—— قیام واستحکامِ پاکستان

حسن رضا اقبالی

علامہ محمد اقبالؒ کے یہاں بے خودی سے مقام فنا مراد نہیں بلکہ بے خودی سے اُن کی مراد ہے، انسان کا انفرادیت کی منزل سے نکل کر اجتماعیت کی منزل میں آنا۔ فرد کو انفرادی مقاصد کے لیے جدوجہد کرنا لازمی ہے لیکن جب تک وہ اپنے ذاتی مقاصد کو قوم کے وسیع تر مقاصد پر قربان نہیں کرے گا اس کی خودی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔ اقبالؒ کا نظریہ یہ ہے کہ ہر فرد کی ذات میں انفرادیت اور اجتماعیت کے عناصر اس طرح پیوستہ ہوتے ہیں کہ انہیں جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اسرار خودی کے بعد رموز بیخودی لکھی۔ اور اوّل الذکر میں فرد کی شخصیت کے ذاتی یا انفرادی پہلو کی اور آخر الذکر میں اس کی شخصیت کے اجتماعی یا عمرانی پہلو کی تربیت کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جس طرح فرد پیدا ہوتا ہے اسی طرح قومیں بھی پیدا ہوتی ہیں یعنی قوموں کی تخلیق میں وہی قانون کارفرما ہے جو فرد کی تخلیق میں ہے۔ وہ یہ کہ جب:

الف۔ زندگی کسی قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے تو فرد موجود ہوجاتا ہے۔

ب۔ وہی زندگی (بصورت افراد) جب کسی مرکز پر مجتمع ہوجاتی ہے تو قوم وجود میں آجاتی ہے۔

بالفاظ دیگر:

الف۔ زندگی جب کسی تن سے مربوط ہوجاتی ہے تو اسے فرد کہتے ہیں۔

ب۔ وہی زندگی جب کسی مرکز سے وابستہ ہوجاتی ہے تو اسے قوم سے تعبیر کرتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ:

۱۔ جماعت کے بغیر فرد اپنی شخصیت کی تکمیل نہیں کرسکتا ہے۔

۲۔ افراد کے بغیر جماعت کا وجود متحقق نہیں ہوسکتا ہے۔

اقبال اپنے خطبات میں یوں لکھتے ہیں:

جماعت کے ساتھ منسلک رہنے سے فرد میں مشاہدہ کی قوّت اور جذبات کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور

ارادہ میں حرکت پیدا ہوجاتی ہے۔[۱]

ملت افراد کے اختلاط وآمیزش سے پیدا ہوتی ہے اوران کی تربیت کی تکمیل نبوت کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ اگرچہ فرد کی فطرت مائل بہ یکتائی ہے مگر اس کا تحفظ انجمن آرائی سے ہی ممکن ہے۔ الخضر فرد کی بقاء ذات خداوندی سے اور ملت کی زندگی رسالت سے وابستہ ہے۔ اورشعر کے پردے میں اسی بات کوعلامہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

خودی کی خلوتوں میں کبریائی
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی[۲]

ملت ابراہیمؑ کی بنیاد وطنیت کے محدود مادی تخیل پرقائم نہ تھی، بلکہ اس کا سب سے پہلا جزو توحید تھا۔ اس لیے ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی جن روحانی ارکان واصول سے ہوتی ہے ان میں سب سے سب مقدم یہی توحید ہے؛ توحید کے بعد اس ملت کا دوسرا روحانی عنصر نبوت اور رسالت ہے، کیوں کہ اس ملت کوحضرت ابراہیمؑ نے پیدا کیا تھا اور وہ پیغمبر تھے۔ اس لیے وہ رسالت سے عالم وجود میں آئی اور رسالت ہی کی آغوش میں نشو ونما پائی۔ امت کا ابتدائی وانتہائی سلسلہ دو پیغمبروں کی ذات سے ملا ہوا ہے۔ ان دونوں اجزاء یعنی توحید ورسالت کی بنا پر ملت اسلامیہ کسی خاص ملک، کسی خاص مقام اور کسی خاص خطہ تک محدود نہیں ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک کلمہ پر اس کی بنیاد رکھ کر ایک ''ملتِ گیتی نورد'' پیدا کر دی ہے۔

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد[۳]

میں سمجھتا ہوں کہ اسرار خودی کی بنیاد کلمہ طیبہ کے پہلے جزو ''لا الہ الا اللہ'' اور رموز بیخودی کی بنیاد کلمہ کے دوسرے جزو ''محمدؐ رسول اللہ'' پر استوار ہے۔ قومیت کی پیدائش، افراد کی اجتماعی کیفیت سے ہوتی ہے۔ اور اجتماعی کیفیت صرف نبوت کے یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی یقین منتشر افراد کو ایک سلسلہ میں منسلک کر دیتا ہے۔ اور غایت محمدؐ یہ کی اساس ''حریت، مساوات اور اخوت'' ان سہ گانہ اصولوں پر قائم ہے۔ یعنی کہ؛

۱۔ توحید سے حریت پیدا ہوتی ہے۔
۲۔ حریت کا منطقی نتیجہ مساوات نسل انسانی ہے کیونکہ جب تمام انسان ایک خدا کے بندے ہیں اور کوئی انسان کسی دوسرے کا غلام نہیں ہے تو لامحالہ سب انسان برابر ہیں۔
۳۔ مساوات کا منطقی نتیجہ اخوت ہے کیونکہ اگر تمام انسان ہم مرتبہ ہیں تو سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

رموز بیخودی کے آخر میں علامہ نے سورۃ اخلاص کی تفسیر میں دونوں مثنویوں کے افکار کا خلاصہ

مجمل شکل میں بیان کیا ہے۔ اس سورۃ کی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان کیا ہے کہ وہ (۱) احد ہے، (۲) صمد ہے، (۳) لم یلد ولم یولد ہے، (۴) لم یکن لہ کفواً احد؛ کا مصداق ہے۔ لیکن اقبال نے ان صفات اربعہ سے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ:

۱۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات کے اعتبار سے یکتا ہے، مسلمان کو بھی اپنے اندر بقدر بشری یکتائی کی شان پیدا کرنی چاہیے۔

۲۔ جس طرح اللہ تعالیٰ صمد ہے یعنی کسی طاقت کا محتاج نہیں ہے، اسی طرح مسلمان کو بھی اپنے اندر شان ِ بے نیازی پیدا کرنی چاہیے۔

۳۔ جس طرح خدا مادی علائق سے پاک ہے اسی طرح ملتِ اسلامیہ کو بھی وطن، نسب، رنگ اور نسل کے امتیازات سے بالاتر ہونا چاہیے۔

۴۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ اسی طرح ملت اسلامیہ کو ایسی سربلندی حاصل کرنی چاہیے کہ کوئی قوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہ کر سکے۔

رموز بیخودی......قیامِ پاکستان

حضرت حکیم الامت نے رموزِ بیخودی میں ملت اسلامیہ کے مختلف اجزائے ترکیبی اور اس کی مجموعی حیثیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ حیاتِ ملی کا کمال یہ ہے کہ قوم کے تمام افراد ایک مخصوص آئین کی پابندی سے اپنے جذبات ورجحانات کی حدیں مقرر کریں۔ تا کہ انفرادی اعمال کا اختلاف ہو کر ساری قوم میں یکسانیت واشتراک عمل وقول پیدا ہو جائے۔ اس مثنوی کا لبِّ لباب یہ ہے کہ دین اسلام کسی ایک شخص کا دین نہیں ہے، اور نہ دوسرے مذاہب کی طرح پوجا پاٹ کا نام ہے۔ بلکہ حیاتِ انسانی کی ایک مخصوص مجموعی شکل کا نام ''دین اسلام'' ہے۔ اور اس دین کا دستور العمل ایک ایسا قانون ہے کہ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے، تو ملت اسلامیہ کا فرد نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اپنی خودی کو معراجِ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے، کہ ساری دنیا کے مسلمان مل کر اس دستور کے احکام کی پابندی کریں۔

خودی کے ارتقاء کا طریقہ اقبالؒ نے رموز بیخودی میں بیان کیا ہے۔ تفصیلات کے بغیر اس کو بھی حسبِ ذیل نکات کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ فرد کی خودی کے ''ارتقاء'' کا عملی ذریعہ، اقبال کی نظر میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ایک ایسے معاشرے کا قیام جس کی بنیادیں انسان کی فطرت صحیحہ میں گہرے طور پر پیوست ہوں۔ یہ بنیادیں ان کے نزدیک دو ہیں:۔

(الف)	ایمان باللہ

(ب)	ایمان بالرسول

ایمان باللہ کے تعلق سے ان کا خیال تھا کہ اللہ کی اطاعت خود انسان کی اپنی فطرت صحیحہ کی اطاعت ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول کی ذات اجتماعی زندگی کا محور ہوتی ہے۔ اور وہی ہے جو فطرت صحیحہ کے اصولوں پر معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ ان دو بنیادوں کے علاوہ اس معاشرہ میں مندرجہ ذیل پانچ خصوصیات ہونی چاہئیں جو انسان کی فطری امنگوں کے عین مطابق ہیں:

(ا) اخوت	(ب) مساوات	(ج) حریت

(د) عالمگیریت (یا نہایت مکانی)	(ھ) ابدیت (یا نہایت زمانی)

اوّل الذکر تین معاشرہ کی داخلی خصوصیات ہیں اور باقی دو خارجی خصوصیات ہیں۔

۲۔ اس معاشرہ کے لیے ایک آئین اور دستور کا ہونا ضروری ہے اور یہ دستور بھی مثالی اور فطری ہونا چاہیے۔ یہ دستور اقبال کی نظر میں قرآن مجید ہے۔

۳۔ اس معاشرہ کے لیے ایک نصب العین ہونا چاہیے اور یہ نصب العین بھی نہایت اعلیٰ وارفع ہونے کے ساتھ ساتھ فطری ہونا چاہیے۔

اقبال کی نگاہ میں یہ بلندترین فطری آدرش ہے ''حفظ ونشر توحید''۔

۴۔ اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح فرد کی خودی ہوتی ہے اسی طرح معاشرہ (ملت یا قوم) کی بھی ایک خودی ہوتی ہے، جس کو وہ ''اجتماعی خودی'' یا ''قومی خودی'' کا نام دیتے ہیں۔

۵۔ انفرادی خودی اس ملی یا قومی خودی سے ہم آہنگ ہو کر ہی منازل ارتقاء طے کرتی ہے اور یہی ہم آہنگی اور ربط واختلاط ہی ''بے خودی'' ہے۔ اقبال کی نظر میں فرد و معاشرہ میں ربط اور ہم آہنگی بے حد ضروری ہے، کہ فرد، معاشرہ یا ملت سے الگ تھلگ رہ کر اپنی خودی کو اس فطری بلندیوں تک نہیں پہنچا سکتا۔ وہ الگ تھلگ رہے گا تو اپنی خودی کے خول کے اندر بند رہے گا؛ ملت سے پیوستہ یا ہم آہنگ ہوگا تو اس خول کو توڑ کر اپنی خودی کو ارتقاء کی منزلوں تک پہنچائے گا۔

در جماعت خود شکن گردد خودی
تاز گلبرگے چمن گردد خودی[۴]

ملت سے یہ ربط و پیوستگی خودی کے ارتقاء کے لیے اقبال کی نظر میں ایک ناگزیر منزل ہے۔

۶۔ جب خودی کے ارتقاء کے لیے فرد و معاشرہ (ملت وقوم) کا باہمی ربط یا ہم آہنگی ضروری قرار پائی تو اس ہم آہنگی میں توازن بھی ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ معاشرہ (ملت وقوم) فرد کو دبوچ لے یا فرد معاشرہ

(ملت وقوم) کی گردن پر سوار ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں خودی کا نقصان ہے۔ پہلی صورت میں خودی گھٹ کو رہ جاتی ہے تو دوسری صورت میں خودسر بن جاتی ہے۔ یہ توازن اگر انہیں کہیں نظر آتا ہے تو اسلام کے آئین حیات میں۔ یہاں صرف توازن ہی نہیں بلکہ انتہائی درجہ کا توازن وتوافق ہے۔ اسی لیے وہ فرد کو ایسی ہی ملت ربط واتصال پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

یہ ہے ''ارتقائے خودی'' کا فلسفہ یا طریقہ جو انہوں نے رموز بیخودی میں پیش کیا ہے۔

یہاں اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ اقبال نے ارتقائے خودی کے لیے جس معاشرہ کا تصور پیش کیا اس میں شک نہیں کہ وہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ ہے۔ تاہم معاشرہ کا یہ تصور اقبال نے محض کسی عصبیت کی بناء پر نہیں بلکہ صرف اور صرف ارتقائے خودی کے مسئلہ کے عملی حل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یہی بات انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> میری فارسی نظموں (مراد اسرار خودی ورموز بے خودی) کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں، بلکہ میری قوت طلب وجستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشری نظام تلاش کیا جائے۔ اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشری نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصدِ وحید، ذات پات، رتبہ ودرجہ، رنگ ونسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔[۵]

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال بہت بڑے شاعر اور عظیم مفکر وفلسفی تھے۔ اسرار و رموز پر عموماً اقبال کی اعلیٰ ترین فکری وشعری تخلیق کی حیثیت ہی سے نظر ڈالی جاتی رہی ہے اور یہ ہے بھی ان کا نہایت ہی بلند پایہ فکری وشعری کارنامہ۔ تاہم وہ ان شعراء میں سے نہ تھے جو صرف اپنے تخیل کی بلند پروازیوں میں گم رہتے ہیں، اور وہ ایسے فلسفی ومفکر بھی نہ تھے جو اپنے افکار ونظریات کی بھول بھلیوں کھو جاتے ہیں، انہوں نے زندگی کے حقائق کا نہایت گہرے فلسفیانہ انداز سے کھوج لگایا اور پھر ان حقیقتوں کو شعر کا آب ورنگ بخشا تھا۔ اور ایسا انہوں نے صرف اس لیے کیا کہ ان حقائق کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا جائے کہ وہ ذوق وشوق سے ان کا نہ صرف مطالعہ کریں بلکہ ان پر عمل پیرا ہوں۔ غور سے دیکھئے تو ان کی یہ فکری وشعری تخلیق دراصل ایک عملی منصوبہ ہے، خودی کے استحکام وارتقاء کا یہ منصوبہ انہوں نے بیسویں صدی کے دوسرے عشرہ (۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۸ء) میں پیش کیا۔ یہ پہلی عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ اس جنگ اور اس کے مابعد دور کے متعلق ان کا اپنا تاثر یہ تھا کہ؛

> یہ ایک قیامت تھی۔ جس نے پرانی دنیا کے نظام کر قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ اور اب تہذیب وتمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔[۶]

اقبال نے ایسے پر آشوب اور قیامت خیز زمانہ میں اپنا یہ عملی منصوبہ پیش کیا۔ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ، اقبال کے انداز ہ و معیار کے مطابق، یہ ''نیا آدم'' وہی ہوسکتا ہے جس کی خودی مستحکم ہو چکی ہو اور یہ ''نئی دنیا'' وہی ماحول یا معاشرہ ہوسکتا ہے جس میں رہتے ہوئے یہ ''آدم'' اپنی خودی کو اس انتہائی بلندیوں تک پہنچا سکے۔ خیر یہ تو ایک تصوری یا تخیل بات تھی یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ ایک خواب تھا جو 'شاعر' اقبال نے اپنے محاکاتی تخیل کی مدد سے دیکھا تھا۔ اور ہر بڑا شاعر اور ہر عظیم فلسفی خواب تو دیکھا ہی کرتا ہے۔ مگر اقبال نے اپنے اس خواب کی عملی تعمیر بھی پیش کی۔ انہوں نے ایک ''نئی دنیا'' کی تعمیر کا نقشہ ـــ گو چھوٹے پیمانہ پر ہی سہی ـــ پیش کیا تا کہ آنے والا ''نیا آدم'' اپنی خودی کو بلند تر کر سکے۔

اقبال نے پہلی عالمی جنگ کے دوران خودی کی تربیت، استحکام اور ترقی کا یہ عمل منصوبہ پیش کیا، لیکن شاید اس کا خاکہ ان کے ذہن میں ۱۹۰۸ء کے بعد ہی سے وہ ''اسلامی قومیت'' کا آوازہ بلند کرنے لگے تھے۔ اور یہ اسلامی قومیت اس مثالی معاشرہ کا عملی مظہر تھی جس کا نقشہ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں اپنی مثنوی رموز بیخودی میں پیش کیا ہے۔ اس زمانہ میں برصغیر جنوبی ایشیاء پر برطانیہ کی حکومت تھی جس کا نقشہ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں اپنی مثنوی رموز بیخودی'' میں پیش کیا ہے۔ اس زمانہ میں برصغیر جنوبی ایشیاء پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ کچھ عرصہ قبل اس حکومت سے گلوخاصی کی تحریک شروع ہوگئی تھی، اس تحریک میں برصغیر کے رہنے والے ہندو مسلمان سبھی شریک تھے۔ اسی لیے متحدہ وطنی قومیت اس کی بنیاد قرار پائی۔ عملی سیاست کی خارزار راہوں سے یہ تحریک گزرتی رہی۔

علامہ اقبال نے ۱۹۲۴ء تک ملک کی سیاست میں کوئی قابل ذکر عملی حصہ نہیں لیا، بجز اس کے وہ اس وطنی قومیت کے خلاف اسلامی قومیت کا دم بھرتے رہے۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ کل ہند سیاست میں جو مد و جزر پیدا ہوتے رہے ان پر انہوں نے گہری نظر رکھی اور ان میں بھی انہوں نے عملاً حصہ لیا۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ شائع ہوئی، جس سے برصغیر کی سیاست میں بھونچال سا آ گیا اور اس بھونچال نے ''متحدہ قومیت'' کے تصور کو پاش پاش کر دیا۔ پھر یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ برطانیہ سے گلوخلاصی کی جو تحریک اس متحدہ قومیت کی بنیاد پر چلائی جا رہی تھی، وہ اپنے منطقی نتیجہ پر پہنچنے کے بعد عملاً تمام باشندگان برصغیر کے لیے آزادی کا پیام نہ لائے گی بلکہ وہ ایک مخصوص گروہ یا طبقہ کو دوسرے گروہ پر اپنا مکمل اور مستقل تسلط جمانے کا موقع فراہم کرے گی۔

بحرِ سیاست کے اس طوفان میں اقبال اسلامی قومیت کے لنگر کو مضبوطی سے تھامے رہے اور متحدہ قومیت کی پرشور موجوں کے تباہ کن اثرات سے ہر ایک کو آگاہ کرتے رہے۔ ۱۹۲۸ء میں، نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد، علامہ اقبال کے بیان کردہ خطرات اور اندیشے سب کو بالعموم اور اس گروہ کو بالخصوص بچشم

سر نظر آنے لگے جس سے اقبال نے اپنے مثالی معاشرہ کے قیام کی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اب برصغیر کی سیاست ایک موڑ پر آ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو ۱۹۰۸ء ہی سے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ خودی کو پروان چڑھانے کے لیے جس معاشرہ کا تصور ان کے ذہن میں ہے وہ برطانیہ سے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی برصغیر میں قائم نہ ہو سکے گا۔ اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ متحدہ قومیت کا وہ تصور تھا جس پر کل ہند کانگریس نے اپنی تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ابتداء ہی سے اس کے خلاف رہے لیکن بحرِ سیاست میں جو لہریں اٹھتی ہیں ان کے نتائج فی الفور نہیں، کچھ عرصہ بعد ظاہر ہوتے ہیں۔

اب ۱۹۲۸ء میں، نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد، یہ نتائج سامنے آ گئے تھے۔ متحدہ قومیت کا اصلی رنگ وروپ ظاہر ہو چکا تھا۔ اقبال نے محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اپنی اس تجویز کا علی الاعلان سب کے سامنے پیش کر دیں جس کے ذریعہ وہ سمجھتے تھے کہ ایسے معاشرہ کا قیام، پورے برصغیر میں نہ سہی تو اس کے بعض گوشوں میں، ممکن ہو سکے گا جہاں ان کے تصور کے مطابق خودی کے استحکام وارتقاء کے مواقع بہم پہنچائے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنی وہ معرکہ آراء تجویز پیش کر دی جس نے برصغیر کی تاریخ کے دھارے کے رخ کو موڑ دیا۔ ان کی اس تجویز کو ان ہی کے الفاظ میں سنیے۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

> میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد مملکت بنا دی جائے۔ برطانوی سلطنت کے اندر حکومت خود اختیاری ملے یا برطانوی سلطنت سے باہر، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم ومتحدہ مسلم مملکت کی تشکیل مسلمانوں۔۔۔ کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں۔۔۔ کے لیے بالآخر مقدر ہو چکی ہے۔[۷]

پھر اس مملکت کے قیام کی غرض وغایت بھی انہوں نے اسی خطبہ میں یہ بیان کی:

> برصغیر ہند دنیا میں سب سے بڑا مسلم بلاک ہے۔ اس ملک میں اسلام کی زندگی، بحیثیت ایک تمدنی قوت کے، بڑی حد تک اس امر پر منحصر ہے کہ اس کو ایک مخصوص رقبہ میں مرتکز کر دیا جائے۔[۸]

گویا اسلام کا تمدنی قوت کی حیثیت سے ارتکاز ہی اس مملکت کے قیام کا مقصدِ اولین ہے۔ تمدنی قوت کی حیثیت سے اسلام کے ارتکاز کی توضیح بھی انہوں نے ان الفاظ میں کی؛

> میں ایک مستحکم ومتحدہ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے اسلام کے لیے ایک ایسا موقع حاصل ہوگا کہ وہ اس ٹھپہ سے نجات حاصل کرے جو عرب شہنشاہیت نے اس پر لگا دیا ہے اور اپنے قانون، اپنی تعلیم، اپنی ثقافت کو حرکت میں لائے اور انہیں اپنے اصلی مزاج اور عصرِ حاضر کی روح سے قریب تر کر دے۔[۹]

اس مملکت کے مقاصد کی وضاحت سے قبل انہوں نے اسی خطبہ صدارت کے ابتدائی حصہ میں اسلام کی بحیثیت ایک نظام معاشرت و سیاست نہایت عالمانہ انداز میں تشریح کی۔غور کرنے کی یہ بات ہے کہ اس وقت وہ ملک کی ایک سیاسی جماعت کے سالانہ اجلاس کی صدارت کررہے تھے۔ یہ جماعت مسلمانوں کی ایک سیاسی تنظیم تھی،کوئی علمی ادارہ یا تبلیغی مجلس نہ تھی۔اس کا مقصد تو مسلمانوں کے سیاسی مفادات کا اس وقت کے حالات میں تحفظ کرنا تھا۔عموماً سیاسی جماعتوں کے سالانہ اجلاسوں اور کانفرنسوں کے خطبہ ہائے میں اس قسم کی خالص علمی باتیں نہیں کی جاتیں، وہاں تو حالات حاضرہ پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔اور اسی کی روشنی میں جماعت کی حکمت عملی (پالیسی) کو مرتب کرنے کے لیے خطوط واضح کیے جاتے ہیں۔لیکن اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں اس روایت کو بڑی حد تک توڑا۔ انہوں نے اس وقت کے سیاسی حالات پر گفتگو تو ضرور کی اور اپنی جماعت کی پالیسی کو متعین کرنے کے لیے بعض امور کی نشاندہی بھی کی،لیکن خطبہ کا آغاز اسلام کے معاشرتی وسیاسی نظام کی وضاحت سے کیا۔اپنے خطبہ صدارت کا ایک تہائی حصہ انہوں نے اسی علمی گفتگو کے لیے مختص کر دیا۔اس کے بعد والے حصہ میں بھی انہوں نے اس وقت کے سیاسی حالات پر اپنی جماعت کے نقطہ نظر سے بحث ضرور کی،لیکن بیچ بیچ میں حسبِ موقع وہ اسلام کے معاشرتی وسیاسی نظام کی مختصراً تشریح کرتے گئے۔ اگر ایک ایسا شخص جو اقبال کے بنیادی افکار سے قبل از قبل واقف نہ ہو اس خطبہ کا مطالعہ ایک سیاسی تقریر کی حیثیت سے کرے تو غالبًا اس کو مایوسی ہوگی۔شاید وہ آغاز ہی میں اکتا جائے، کیونکہ اس کے ابتدائی حصہ میں سیاست تو بالکل ہے ہی نہیں ، ہاں علمیت ضرور ہے۔سوال یہ ہے کہ اقبال نے یہ اندازِ تخاطب کیوں اختیار کیا؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ مخاطب کے ذہن کو اس تجویز کے سننے اور اس کی معنویت پر غور کرنے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ جو انہوں نے اپنے خطبہ صدارت کے تقریباً آخری حصہ میں پیش کی،یعنی برصغیر جنوبی ایشیا میں ایک متحدہ، مستحکم مسلم مملکت کا قیام۔

اقبال کے کلام، بالخصوص فارسی مثنویوں (اسرار خودی اور رموز بیخودی)،کو پڑھیے پھر ان کے اس خطبہ صدارت کے اس ابتدائی حصہ کی عالمانہ بحث پر غور کیجیے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ایک ہی ذہن ہے جو شاعری اور سیاست میں کام کررہا ہے۔وہاں جس معاشرہ کا تصور انہوں نے تخیل کے رنگ میں رنگین کر کے نظم کے ذریعہ پیش کیا ہے، اسی تصور کو یہاں نثر میں پیش کیا گیا ہے۔ وہاں تفصیل ہے تو یہاں قدرے اجمال ہے۔وہاں خطاب دل سے ہے تو یہاں دماغ سے۔

مثنوی اسرار و رموز میں بیان کردہ حقائق کے پس منظر میں اگر اقبال کے خطبہ صدارت کے ابتدائی حصہ، پھر اس کی مسلم مملکت والی تجویز اور اس کے اغراض و مقاصد کی تشریح پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک مربوط سلسلہ فکر ہے۔اسرار ورموز خودی کے استحکام وارتقاء کا ایک منصوبہ ہے تو

مسلم مملکت کا قیام اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کی ایک تجویز۔ پہلے وضاحت کی جا چکی ہے کہ اقبال نے اسرار میں انفرادی خودی کو مستحکم کرنے پر زور دیا ہے۔ اور اس کے گر بتائے ہیں۔ رموز بے خودی میں انہوں نے خودی کے ارتقاء کا طریقہ بتایا ہے اور وہ طریقہ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ہے، یہ ہے کہ فرد ایک ایسے مخصوص معاشرہ (قوم یا ملت) کا رکن بن جائے جس میں ان کی بیان کردہ خصوصیات اور خوبیاں پائی جاتی ہوں۔ پھر فرد کی خودی اور اس معاشرہ (قوم یا ملت) کی خودی میں کمال درجہ کی ہم آہنگی اور باہمی ربط بھی ہو اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ یہ معاشرہ شاعر کے خلائی ذہن میں ہی رہے گا یا اس کو منصۂ شہود پر کہیں جلوہ گر کیا جائے گا؟ ایسا معاشرہ کسی کرۂ فضائی یا خلا میں تو قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو برپا کرنے کے لیے تو کرۂ ارض ہی کا کوئی خطہ چاہیے۔

اقبال نے اپنے خطبہ صدارت میں ایک متحدہ و مستحکم مسلم مملکت کے قیام کی تجویز کے ذریعہ ایک ایسے ہی خطہ کا تعین کیا تھا جہاں اس قسم کا معاشرہ تعمیر کیا جا سکے، جس کو وہ مثالی معاشرہ قرار دیتے ہیں اور جس کا نقشہ انہوں نے رموز بے خودی میں پیش کیا ہے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۹۳۰ء میں اقبال کے ذہن میں جو مملکت کا تصور ابھرا تھا، اس کا محرک دراصل خودی کے استحکام و ارتقاء کا وہ منصوبہ تھا، جو انہوں نے اپنی مثنویوں میں ۱۹۱۸ء میں پیش کیا تھا۔ بالفاظ دیگر اقبال کے پیش کردہ منصوبہ استحکام و ارتقائے خودی کی عملی صورت گری کا دوسرا نام پاکستان ہے۔

رموز بیخودی ـــــ استحکامِ پاکستان

علامہ اقبال تجدید و احیاءِ دین کی جدوجہد کی سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہیں ان کی دعوت یہ ہے کہ دین اسلام کو از سرِ نو نظام زندگی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ اقبال کا نظریاتی نظام اسلام ہے۔ اس کی مثالی ہیئت حاکمہ خلافت راشدہ ہے اس کے آئیڈیل ہیرو خلفائے راشدینؓ ہیں۔ اس لیے اقبال کی نظریاتی قومیت، اخلاقی نصب العین، اصولی مؤقف رکھتی ہے وہ نسل، زبان، خطے، رنگ یا قبیلے میں قومیت تلاش نہیں کرتا۔ نظریے کے اندر اصولِ اجتماعیت تلاش کرتا ہے۔ اور چوں کہ پوری بنی نوع انسان کے پاس ایک نظریاتی نصب العین جو اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے صرف اسلام ہی ہے۔ اس لیے وہ اسلام کے بین الاقوامی کردار کو ساری دنیا کے سامنے پیش کر کے اسلام کے اخلاقی نصب العین کی طرف دعوت دیتا ہے۔

> اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔[۱۱]

آگے چل کر انھوں نے کہا کہ؛

اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے الگ نہیں دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا، میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحہ کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصولِ اتحاد کی نفی پر مبنی ہو۔[۱۱]

اقبال اپنے مطالعہ کی بنا پر یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی بقاء کا راز اسلامی نصب العین میں ہی پوشیدہ ہے۔ اگر مسلمان اسلامی نصب العین کے لیے جدوجہد سے دستبردار ہوگئے تو وہ تاریخی قوتوں کے ریلے میں بہہ جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہوجانے سے انہیں کوئی چیز بھی نہیں بچا سکے گی۔ انہوں نے اپنے خطبے میں کہا؛

ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے وہ یہ ہے کہ صرف اسلام ہی تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت سے محفوظ ہو جائے گا۔[۱۲]

اس لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا نظامِ مملکت موجود ہو جو معاشرے کے سارے پہلوؤں پر حاوی ہو اور اسلام کے سوا یہ خوبی کسی نظام میں بھی نہیں ہے۔ اسلام جس قدر زندگی کے مختلف گوشوں میں جلوہ گر ہوتا ہے اسی قدر اس کی ہم آہنگی یک رنگی نیز گوناگوں بوقلمونی انسانی زندگی کو برکات وحسنات سے معمور کر دیتی ہے۔ اقبال جس مملکت کا خواب دیکھتے ہیں وہ مساوات انسانی کا مثالی نمونہ ہے۔ چنانچہ کہا کہ:

اسلام، اب بھی ایسی دنیا پیدا کر سکتا ہے، جہاں انسان کا معاشرتی درجہ، اس کی ذات، رنگ اور اس کے کمائے ہوئے منافع کی مقدار سے معین نہ ہوتا ہو، بلکہ اس زندگی کے مطابق قائم کیا جاتا ہو جسے وہ بسر کرتا ہے۔ جہاں غرباء مالداروں پر ٹیکس عائد کرتے ہوں۔ جہاں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر قائم نہ ہو بلکہ روحوں کی مساوات پر ہو، جہاں نجی ملکیت ایک ٹرسٹ کی حیثیت رکھتی ہو اور جہاں سرمایہ جمع کرنے کی اس طرح اجازت نہ دی جائے کہ وہ اصلی دولت پیدا کرنے والے پر غلبہ حاصل کر لے۔[۱۳]

اسلامی مملکت کے بارے میں اقبال کا تصور یہ ہے کہ وہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے لحاظ سے بین الاقوامی ہے۔ اس میں رنگ ونسل اور علاقہ وجغرافیہ کی محدودیتوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے:

عالم اسلامی کا ظہور ہوگا تو آزاد اور خود مختار وحدتوں کی ایک ایسی کثرت میں جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترک روحانی نصب العین نے توافق وتطابق سے بدل دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ شاید ہم مسلمانوں کو بتدریج سمجھا رہی ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے، نہ شہنشاہیت بلکہ ایک انجمن اقوام ہے جس نے ہمارے خود پیدا

کردہ حدود اور نسلی امتیازات کو تسلیم بھی کیا ہے تو محض سہولتِ تعارف کے لیے۔[۱۴]

انھوں نے اپنی وفات سے صرف چار ماہ پہلے ایک پیغام دیتے ہوئے فرمایا؛

جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کو مٹایا نہ جائے گا، اجب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیاں اللہ کے اصول کا قائل نہ ہوجائے گا اور جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیازات محو نہ ہوجائیں گے اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کرسکیں گے اور نہ اخوت و حریت و مساوات کے عظیم الفاظ شرمندہ ہوں گے۔[۱۵]

ایک موقعہ پر انہوں نے اسلامی مملکت کے فرائض کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا:

حکومت کا تو سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ لوگوں کے اخلاق کی حفاظت کرے لیکن آج کل کی حکومتیں تو صرف لوگوں کے سیاسی خیالات و رجحانات کی نگرانی اور احتساب کا کام ہی کرتی ہیں۔[۱۶]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال پر یہ بات بہت اچھی طرح واضح تھی کہ اسلام ایک نظامِ مملکت ہے اور ایک مملکت کے وجود کے بغیر اسلام کا عملی تصور ادھورا رہ جاتا ہے۔ اس نوبت پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس قسم کی سوسائٹی خودی کے ارتقاء کے لیے سازگار ہے۔ اور کونسا معاشرہ انفرادی اور اجتماعی ترقی کا ضامن ہوسکتا ہے؟ ۔۔۔۔اقبال کے نزدیک آئیڈیل سوسائٹی اور استحکام پاکستان کے لیے امورِ ذیل کی ضرورت ہے:۔

۱۔ روحانی اقدار مثلاً اصول وحدت کی بنیاد پر قائم کی جائے۔

۲۔ رسالتؐ اس کا محور ہو۔

۳۔ اس کا اپنا نظامِ حیات ہو۔

۴۔ اس کا ایک مرکز ہو۔

۵۔ ایک نصب العین اس کے سامنے ہو۔

۶۔ تسخیر فطرت اس کی جدوجہد میں شامل ہو۔

۷۔ وہ اپنی روایات کو محفوظ رکھتی ہو۔

۸۔ امومت کا وہ احترام کرتی ہو۔

وحدت

کسی عظیم تر ملت کی تعمیر کے لیے روحانی بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے، یہ مضبوط بنیاد ہمیں صرف وحدت کی تصور ہی مل سکتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں:

جدید تمدن عالمی اتحاد کے لیے اصولِ توحید کو بنیاد بنا سکتا ہے۔ اور اسلام ایک مکمل نظامِ حیات کی حیثیت

سے اس اصول کو انسانی ذہن میں زندہ شکل دے سکتا ہے۔ اسلامی تعلیم کے مطابق خدا کے ساتھ دفاداری ضروری ہے نہ کہ تخت و تاج کے ساتھ۔ اس لیے باری تعالیٰ سے وفاداری کا مطلب انسان کی خود اپنی فطرت کے ساتھ وفاداری ہے۔[۱۷]

عقیدۂ توحید ایک فطری عقیدہ ہے جو نہ صرف فرد کے لیے قابل قبول ہے بلکہ ملت کو ایک ایسی نفسیاتی اساس بھی فراہم کرتا ہے جس پر اخلاقی قدروں کی تعمیر سے قوم کو طاقت اور عظمت حاصل ہو سکتی ہے۔ وہی دین و مذہب، علم و حکمت، آئین و دستور، فکر و تجسس اور جذبات عشق و محبت انسانیت کے لیے مفید اور کار آمد ہو سکتے ہیں جن کی بنیاد اصولِ وحدت پر رکھی گئی ہو، عقیدۂ توحید انسان کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے اور اس کے جذبۂ عمل کو بڑھاتا ہے۔ اس کے خوف اور ہراس کو زائل کرتا ہے اور اس کے ضمیر کو روشن اور مقامِ عبدیت کو محکم کر کے رموزِ کائنات کو اس پر منکشف کر دیتا ہے:

اہل حق را رمزِ توحید ازبر است   در اتی الرحمٰن عبداً مضمر است
چوں مقامِ عبدہ محکم شو   کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود[۱۸]

عقیدۂ توحید تمام رجعت پسند قوتوں کا ازالہ کرتا ہے، استوار بنیادوں پر انسانی ذہن کی تربیت کرتا ہے، اور انسان کے لیے ایسی روحانی قدریں فراہم کرتا ہے کہ جن سے ملت کو اتحاد اور استقلال نصیب ہو سکتا ہے۔ لا الہ کا تصور انسانی فکر کے لیے ایک مشترک اساس بہم پہنچاتا ہے جس کی بدولت افراد کا احساس بیگانگی رفع ہو کر اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ جو عظیم تر ملت کے قیام کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہی قوم پھول اور پھل سکتی ہے جس کے اغراض و مقاصد مشترک ہوں، جس کے جذبات و وجدانات یکساں ہوں اور جس کے خیر و شر کے معیار میں مکمل آہنگی ہو:

ملت بیضائے تن و جاں لاالٰہ   سازِ مارا پردہ گرداں لاالٰہ
قوم را اندیشہ ہا باید یکے   در ضمیرش مدّعا باید یکے
جذبہ باید در سرشت او یکے
ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکے[۱۹]

سید سلیمان ندوی اپنے مقالے ''ڈاکٹر اقبال کا علمِ کلام'' میں لکھتے ہیں:

نظری حیثیت سے توحید باری کا مفہوم اس سے زیادہ نہیں کہ صرف ایک خدا کے وجود پر اعتقاد رکھا جائے لیکن عملی حیثیت سے جب تک توحید کے ماننے والوں میں عملی اتحاد نہ ہو، محض یہ اعتقاد ناکافی ہے اور اس سے کوئی متحدہ تہذیب، متحدہ تمدن، متحدہ معاشرت اور متحدہ نظام اخلاق پیدا ہو سکتا۔۔۔۔ڈاکٹر اقبال نے توحید باری کی بنیاد اس اتحاد پر رکھی اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام نے توحید پر جو غیر معمولی زور دیا ہے، اس کا

مقصد مسلمانوں میں اتحادِ عمل پیدا کرنا تھا۔[۲۰]

اس کے بعد سید سلیمان ندوی اقبالؒ کے کلام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

توحید وحدت افکار اور وحدت کردار کے مجموعے کا نام ہے۔ مکی زندگی رسول اللہ ﷺ نے توحید کی جو تعلیم دی، اس کا تعلق صرف وحدت افکار سے تھا۔ لیکن اس تعلیم نے جب چھوٹی سی ایک متحد الخیال جماعت پیدا کر دی اور آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہیں فرائض واحکام کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں اور وحدت کردار کا دور شروع ہوا۔ وحدت کردار سے مسلمانوں کی عملی زندگی شروع ہوئی اور انہوں نے مشرکان عرب، عیسائیان روم اور یہودان خیبر وغیرہم کی طاقت کو پاش پاش کر کے اپنا ایک متحدہ نظم سلطنت قائم کر لیا اور ایک زندہ قوم بن گئے۔[۲۱]

رموز بے خودی کی روشنی میں توحید پر عامل ہونے کے فوائد وثمرات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ موحد ہر وقت راہِ حق میں جدوجہد کرتا رہتا ہے۔

۲۔ انسان کی زندگیوں سے دو چیزوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور دو خوبیاں اسکے اندر پیدا ہو جاتی ہیں:

(ا) وہ خوف اور شک سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

(ب) انسان نفسیاتی اعتبار سے اُن تمام اخلاقی عیوب جس کی بنیاد خوف ہے (مثلاً خوشامد، مکاری، چاپلوسی، عیاری، کینہ، جھوٹ، فریب وضمیر فروشی) توحید کی بدولت ان سے چھٹکارا پالیتا ہے۔

۳۔ عمل پر کمر بستہ ہو جاتا ہے اور ضمیر کائنات سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

۴۔ جب مسلمان کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مجھے کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہو سکتا۔

۵۔ توحید ملت کے افراد میں وحدتِ افکار پیدا کر دیتا ہے۔

۶۔ اگر قوم بہ حیثیت مجموعی توحید اختیار کریں تو کائنات پر حکمران ہو سکتی ہے۔

۷۔ توحید میں یہ تاثیر ہے کہ اسود کو احمر کر سکتی ہے یعنی نسل اور رنگ کے امتیازات کو فنا کر دیتی ہے۔

توحید اگر ہمارے زندگی کے ہر شعبے میں نفوذ کر جائے تو پھر ہم یک نما، یک بین، یک اندیش ہو سکتے ہیں۔ ہمارا مدعا، ہمارا مال، ہمارا خیال کا انداز بھی ایک ہے تو پھر تمام افراد میں وحدت کا رنگ پیدا ہو جائے گا اگر ملت اسلامیہ کو جسم قرار دے دیا جائے تو توحید اس کے لیے بمنزلہ روح ہوگی۔

رسالت

اقبال کہتے ہیں کسی ملت کی کامیابی کی ضمانت صرف الہامی قیادت (Inspired Leadership) ہی سے ہو سکتی ہے جس کی بہترین شکل رسالت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ہماری ملت کی بنیاد رکھی۔ اس ملت کی قیادت اللہ کے رسولوں کے ہاتھ میں رہی۔ یہاں تک کہ آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری نبی بن کر

آئے اور دنیا کے لیے ایک واضح شریعت اور ایک مکمل نظام حیات عطا کر گئے:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولؐ ما رسالت ختم کرد[۲۲]

رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت تمام اختلافات کو مٹا کر سوسائٹی کی تقویت میں ممد ومعاون ہوتی ہے۔ پیغمبر اسلام کا ہم پر یہ احسان ہے کہ ان کے عشق نے ہم سب کو ہمنوا اور ہم مدعا کر کے ہماری ملت کو وحدت اور زندگی بخشی ہے:

از رسالت ہم نوا گشتیم ما ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
کثرتِ ہم مدعا وحدت شود پختہ چوں وحدت شود ملت شود[۲۳]

جب کوئی ملت رنگ ونسل، وطن وجغرافیہ کی مادی بنیادوں پر نہیں بلکہ وحدت اور رسالت کی اساس قائم ہوتی ہے تو وہ زمان ومکان کی تحدیدات سے آزاد ہو کر ابدی اور لافانی ہو جاتی ہے۔ وہ اندرونی مرکز گریز عناصر کو کچل دیتی ہے۔ اور بیرونی دشمن کا قلع قمع کر کے موت کے حملوں کا رُخ پھیر دیتی ہے۔ رسول اکرم ﷺ کی اُمت کا جوہر جغرافیہ اور مقام سے وابستہ نہیں رہا۔ آپؐ کے غلام دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلتے چلے گئے۔ مسلمانوں کی اذانیں بر و بحر اور کوہ وصحرا میں گونجتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ طارق بن زیاد نے اندلس پر اپنی فوجیں اُتار دیں اور دشمن کے ساحل پر اپنے جہازوں کو آگ لگا دی۔ لوگوں نے پوچھا کہ وطن کو واپسی کی کیا صورت ہوگی جبکہ سفینہ نذرِ آتش ہو چکا ہے اور یہ ترکِ سبب شریعت میں کہاں جائز ہے۔ طارق کی آنکھوں میں بجلی کی چمک پیدا ہوئی ایک ملکوتی تبسم اس کے ہونٹوں پر رونما ہوا، اور اُس نے اپنی تلوار کو نیام سے کھینچتے ہوئے کہا کہ کرۂ ارض کا چپہ چپہ جس پر کہ خدائے قدوس کی حکومت ہے، غلامانِ محمدؐ عربی کا اپنا وطن اور اپنا گھر ہے:

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت گفتند کارِ تو بہ نگاہ خرد خطاست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست[۲۴]

رسول اللہ ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے ملتِ اسلامیہ کی اساس کو منکشف فرمایا اور یہی واضح کر دیا کہ ملت اسلامیہ کی بنیاد کلمہ توحید ہے اور تمام روئے زمین اُس کی جولا نگاہ ہے:

جوہرِ ما بامقامے بستہ نیست بادۂ تندش بجامے بستہ نیست[۲۵]

ایسی ملت جو روحانی قدروں پر قائم ہوتی ہے وقت کے پنجہ آہنی سے بھی محفوظ رہتی ہے خود خدائے قدیر ایسی ملت کی حفاظت کرتا ہے اور اسے اپنے لطف وکرم سے طاقت وتوانائی پہنچاتا رہتا ہے:

از اجل ایں قوم بے پرواستے استوار از نَحنُ نزلنا ستے

تا خدا اَن یُّطفِئُوا فرمودہ است   از فسردن ایں چراغ آسودہ است [۲۶]

نظامِ حیات

ملت کے استحکام اور مفادات کی ہم آہنگی کے لیے ایک معین آئین اور واضح نظامِ حیات کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ پنکھڑیوں میں ایک آئین کے تحت نظم قائم ہوتا ہے تو وہ پھول بن جاتی ہیں، پھول ایک ترتیب کے تحت گل دستہ بن جاتے ہیں اور آواز میں ضبط سے نغمہ پیدا ہوتا ہے:

برگ گُل شد چوں ز آئیں بستہ شد   گُل زآئیں بستہ شد گلدستہ شد

نغمہ از ضبط صدا پیدا ستے   ضبط چوں رفت از صدا غوغاستے [۲۷]

اسی طرح اقبال کے نزدیک ملت کی ترقی کے لیے آئین سے وابستگی لازمی ہے وہ کہتے ہیں کہ؛

> حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہی ہے کہ افراد کسی آئینِ مسلّم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کی حدود مقرر کریں تا کہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلبِ مشترک ہو جائیں۔ [۲۸]

آئین ہی کے سہارے ملت مشکلات کا سامنا کرتی ہے اور انقلابات کی آندھیوں میں اسی کی بدولت اپنے چراغِ حیات کو روشن رکھتی ہے۔ جو ملت اپنے آئین اور نظامِ حیات کی پابند ہوتی ہے اس کی قدروں کا ایقان بھی اس آئین اور نظامِ حیات کے ساتھ ساتھ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن آئین کی عدم موجودگی میں امدادِ زمانہ سے قدریں بدل جاتی ہیں اور ایک نسل کے واقعات اور حقائق دوسری نسل کی نگاہیں محض توہمات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اپنی تہذیب و روایات پر آنے والی نسلوں کا اعتماد زائل ہو جاتا ہے اور وہ کسی دوسری حوصلہ مند قوم کے طرزِ فکر کی زنجیروں میں گرفتار ہو کر اس کی غلام بن جاتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک کسی ملت کے لیے بہترین نظامِ حیات قرآن مجید ہے۔ لیکن انھیں شکایت ہے کہ مسلمان دوسروں کی افکار کے رہینِ منت ہو رہے ہیں جبکہ ملت اسلامیہ کو غیروں سے کچھ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ پیغمبرِ عربی سے پیمانِ وفا اور محبت باندھ لینا کافی ہے:

اے فلک مشتِ غبار کوئے تو   اے تماشہ گاہ عالم روئے تو

ہمچو موج آتش تہہ پا میروی   تو کجا بہر تماشہ میروی

طرح عشق اندازہ اندر جان خویش

تازہ کُن با مصطفیٰؐ پیمانِ خویش [۲۹]

مرکزِ ملت

جب تک دل تمام چیزوں کو تازہ خون پہنچاتا رہتا ہے اس وقت تک تمام اعضاء میں زندگی رہتی ہے۔

اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ اسی طرح ہر ملت کے لیے ایسے مرکز کی ضرورت ہوتی ہے جہاں سے اُس کی تمام تمدنی جدوجہد کے لیے توانائی اور رہنمائی فراہم ہوتی ہو اور جس سے سارے اجزاء کی شیرازہ بندی بھی ممکن ہو، مملکت اور وفاقی اکائیوں کے لیے دارالخلافہ کی اہمیت اور ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک وسعت پذیر ملت کے لیے مرکز کی ضرورت بھی شدید ہو جاتی ہے۔ دائرہ خواہ کتنا ہی پھیلتا جائے، مرکزی نقطہ اُس میں ترتیب اور ضبط قائم رکھتا ہے۔ یہی صورت ایک مرکز کی ہے۔ جہاں سے ملت کو نظم اور زندگی حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک ملت اسلامیہ کیلیے یہی مرکز بیت الحرام ہے:

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر است　　خط اُودر نقطۂ او مضمر است
قوم را ربط و نظام از مرکزے　　روز گارش را دوام از مرکزے
راز دارو رازِ ما بیت الحرم
سوزِ ماہم سازِ ما بیت الحرم[30]

مرکز سے کسی قوم کی روایات قائم رہتی ہیں جو اُس کی بقا کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کی اُمت نے جب اپنے مرکز کو چھوڑ دیا تو وہ دنیا میں ذلیل وخوار ہوئی:

عبرے اے مسلم روشن ضمیر　　از مآل اُمتِ موسیٰ بگیر
داد چوں آں قوم مرکز راز دست　　رشتۂ جمیعت ملت شکست[31]

نصب العین

صحتمند نصب العین حیاتِ اجتماعی کے انتشار کو رفع کر کے ملت کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور زندگی کو آگے بڑھنے کا موقع نصیب ہوتا ہے:

مدعا گردو اگر مہمیز ما　　ہمچو صرصر می رود شبدیز ما
مدعا رازِ بقائے زندگی　　جمع سیماب توائے زندگی
چوں حیات از مقصدے محرم شود
ضابطہ اسباب ایں عالم شود[32]

مستحکم نصب العین ہماری رگوں میں دوران خون کو تیز تر کر دیتا ہے، ہمارے عزم کو پختگی اور حوصلوں کو بندگی عطا کرتا ہے، اور ملت کو جوشِ عمل اور وحدت فکر بخش دیتا ہے:

گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست　　تیز از سعیٔ حصول مدعاست

مدعا مضرابِ ساز ہمت است مرکزے کو جاذبِ ہر قوت است

دست و پائے قوم راجنباندا د
یک نظر صد چشم را گرداندا د[۳۳]

نصب العین کی بلندی کے تناسب سے ملت کوعظمت اورقوت حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کے مختلف مفکرین کے سامنے مختلف نصب العین رہے ہیں۔ افلاطون ترکِ دنیا وترکِ جہد کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔عیسائیت رہبانیت کی تعلیم دیتی ہے۔ بدھ مت جسمانی خواہشات کے کچل دیئے جانے میں انسان کی نجات سمجھتا ہے۔ جبکہ مسلمان کے وجود کا راز تکبیر میں پنہاں ہے۔اس لیے جب تک کہ تمام عالم میں بانگِ حق بلند نہ ہو مسلمان کو لمحہ کے لیے بھی چین نہیں آنا چاہیے۔قرآن نے مسلمانوں کو اُمت عادل کا خطاب دیا جائے۔ جس کی وجہ سے اُن کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ لہٰذا اُن کا فرض ہے کہ اہل جہاں کو دعوت فکر دیں۔ پیغمبرؐ عربی کی تعلیم اُن تک پہنچائیں اور اپنے مقصد کی تکمیل میں مصروف ہوجائیں تاکہ ان پر راز کائنات کا افشا اور اسرارحیات کا انکشاف ہوسکے:

زآنکہ در تکبیر راز بود تست حفظ و نشرِ لاالہٰ مقصود تست
تانہ خیزد بانگِ حق از عالمے گر مسلمانی نیا سائی دمے
می نہ دانی آیۂ اُم الکتاب اُمت عادل ترا آمد خطاب
نکتہ سنجاں راصلائے عام دہ از علومِ اُمیۂ پیغام دہ

تابدست آورد نبض کائنات
وا نمود اسرارِ تقویمِ حیات[۳۴]

مسلمانوں کے سامنے یہ اعلیٰ ترین آئیڈیل اس لیے بھی رکھا گیا ہے کہ فکرِ انسانی ہمیشہ وسوسوں کی پرورش اور نت نئے بتوں کی تخلیق کرتی ہے۔جس کے باعث انسانیت کو پیہم صدمے پہنچتے رہتے ہیں۔اس کا انسداد تیغِ لاالہٰ ہی سے ہوسکتا ہے۔اورتمام خرابیوں کا ازالہ عقیدۂ توحید ہی کی شمشیر سے ممکن ہے:

فکرِ انساں بُت پرستے بُت گرے ہرزماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آزاری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است

برسرِ ایں باطل حق پیر ہن
تیغ لا موجود الّا ہو بزن[۳۵]

تسخیرفطرت

شخصیت کے ارتقاء کے لیے فطرت کی قوتوں پر تصرف حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس غرض کی تکمیل سائنس کے ذریعے ہو سکتی ہے جو انسان کو بصیرت اور عقل کو پختگی فراہم کرتی ہے۔ تسخیرِ فطرت جہاں فرد کے لیے ضروری ہے وہاں قوم کے لیے موت و حیات کا مسئلہ بن جاتی ہے۔ یہی وجہ کہ قرآن نے رموزِ فطرت پر غور و فکر کی انسان کو بار بار دعوت دی ہے۔ فرمایا ہے کہ وعلم آدم الاسماء کلھا اور سکھا دے آدم کو نام (خواص) سب چیزوں کے۔ یعنی

علم اسماء اعتبار آدم است
حکمتِ اشیاء حصار آدم است [۳۶]

گویا حقیقی زندگی تسخیرِ فطرت کی بدولت نصیب ہوتی ہے۔ انسان اپنے علم کے ذریعے کائنات کی چھپی ہوئی دولت کو برآمد کر سکتا ہے۔ وہ حرارت، نور اور قوت کے سرچشموں پر تصرف حاصل کر کے مادہ کے تمام ممکنات پر قابو پا سکتا ہے۔ اور اس طرح وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جہاں تمام آفاق اُس کے زیرِ فرماں آ جاتا ہے:

تاز تسخیرِ قوائے ایں نظام　　　ذوفنو نیہائے تو گرد و تمام
نائبِ حق در جہاں آدم شود　　　برعناصر حکمِ او محکم شود [۳۷]

قرآنی تعلیم کے زیرِ اثر اسلامی حکماء نے مظاہرِ فطرت کے متعلق غور و فکر پر زور دیا اور استقرائی طریقِ تحقیق کو ترقی دے کر حقیقت اشیاء کی دریافت شروع کی۔ اس طرح انہوں نے افلاطونی نظامِ تصورات کو چھوڑ کر جدید سائنس کی بنیاد رکھی۔ یونانی فلسفہ نے دنیا کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ لیکن ان حکماء نے اس فلسفہ کے زہریلے اثرات کو حیات اجتماعی سے خارج کر کے اسلامی تعلیم کے مطابق عناصر فطرت کی تسخیر کا ذوق پیدا کیا انہی کی بصیرت سے یورپ نے فیض حاصل کیا اور قرطبہ و اندلس کی جامعات سے مستفید ہوئے ان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوئیں۔ ان کے ذہن میں انقلاب برپا ہو گیا۔ اور اس طرح جدید یورپی تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھدی گئی۔ مؤرخین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ برفالٹ کہتا ہے ''عصرِ جدید کے لیے سائنس عربوں کا بیش بہا تحفہ ہے۔''

اسی ذوق کی بدولت مسلمانوں میں بڑے بڑے حکیم اور سائنسدان پیدا ہوتے جا رہے تھے کہ تصوف کا ایک غلط تصور عربوں کے دماغ پر مسلط ہونے لگا اور وہ اس کی رو میں ایسے بہے کہ سائنس کی دنیا میں ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔

اقبال کہتے ہیں کہ کائنات کی قوتوں پر اثبات خودی سے تصرف حاصل ہوتا ہے اور اسی کی بدولت ایک ذرہ سے عالم نو کی تعمیر ممکن ہو جاتی ہے۔ تمام مظاہر فطرت اہل نظر کے سامنے اپنے دامن کو پھیلا دیتے ہیں

اوران کے تجسس کے لیے تختۂ مشق بن جاتے ہیں:

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد عالمے از ذرہ تعمیر کرد

کوہ و صحرا دشت و دریا بحرو بر تختۂ تعلیم ارباب نظر [۳۸]

کائنات کا ہر مظہر انسان کی فکر کو مہمیز لگاتا ہے اور تحقیق و تجسس کی اُسے دعوت دیتا رہتا ہے۔ لیکن انسان عام طور پر اپنی قوت سے لاعلم اور اپنی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی حقیقت کو محسوس کرے تو وہ پہاڑوں کو تحلیل کرسکتا ہے۔ دریاؤں سے گوہر کی جوئے آب نکال سکتا ہے۔ فضائے بسیط میں سینکڑوں دنیاؤں کی دریافت اور ذروں کے اندر بے شمار آفتابوں کا انکشاف کرسکتا ہے:

دست رنگیں کن زخون کوہسار جوئے آبِ گوہر از دریا برآر

صد جہاں دریک فضا پوشیدہ اند مہرہا درذرہ ہا پوشیدہ اند [۳۹]

ضرورت تجسس، تدبر اور بلند حوصلگی کی ہے۔ آفاق کو مسخر کرنے کے لیے عزم کی ضرورت ہے۔ نگاہِ تیز اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکتی ہے اور حرارت و بجلی پر تصرف حاصل کرکے انھیں اپنی کنیز اور خادمہ بنا سکتی ہے:

جستجو را محکم از تدبیر کن انفس و آفاق را تسخیر کن

چشم خود بکشا در اشیا نگر نشہ زیر پردہ صہبا نگر

آنکہ براشیا کمند انداخت است

مرکب از برق و حرارت ساخت است [۴۰]

ضبط روایات

کوئی فرد اثبات خودی کے بغیر معرکہ حیات میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح کوئی قوم اجتماعی خودی کے احساس کی تخلیق کے بغیر معراج کمالِ کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس اجتماعی خودی کا ارتقاء ضبط روایات کے بغیر ناممکن ہے۔ خوشحالی اور کامرانی کے دور میں ہر قوم اعلیٰ اور صحتمند روایات کو جنم دیتی ہے۔ جن کا وجود مصیبت اور تباہی کے ایام میں اس کے لیے زندگی کا سہارا بن جاتا ہے۔ روایات کی اہمیت کا اندازہ یہودیوں کی تاریخ سے ہوسکتا ہے۔ اس چھوٹی سی قوم کو ہر جگہ پریشان کیا گیا اور ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ اُس زندہ رہنے کے امکانات بھی نظر سے اوجھل ہونے لگے۔ لیکن ان تمام آزمائشوں میں اس لیے کامیاب رہی کہ اس نے اپنی قدیم روایات کے دامن کو اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا:

چیست تاریخ اے زخود بیگانہ داستانے قصۂ افسانۂ

ایں ترا از خویشتن آگہ کند   آشنائے کار و مرد رہ کند
روح را سرمایۂ تاب است ایں   جسم ملت راچو اعصاب است ایں [۴۱]

حقیقت کے اندر ماضی اور مستقبل ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ تاریخ ان کے وجود پر روشنی ڈالتی ہے۔ اور اس طرح حقیقت شناس قوموں کی ترقی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ وہ گذشتہ اقدار حیات کی تجدید کرتی ہے۔ اور واقعات کے چہرے سے ماضی کے نقاب کو اُٹھا کر ایک روشن شکل میں انھیں ہمارے سامنے لے آتی ہے:

شمع او بختِ امم راکوکب است   روشن از وے امشب وہم دیشب است
چشم پُرکارے کہ بیندرفتہ را   پیش تو باز آفریند رفتہ را [۴۲]

جس طرح فرد روح اور جسم کے ربط سے زندہ رہتا ہے اور قوم اپنی قدیم عظمت کے تحفظ کی بدالت قائم رہتی ہے:

زندہٗ فرد از ارتباط جان و تن   زندہ قوم از حفظ ناموس کہن [۴۳]

اسی طرح اپنی تاریخ کے تحفظ سے ہم دنیا میں سرخرو رہتے ہیں اور روایات کی یاد ہماری خودی کو زندہ اور برقرار رکھتی ہے۔ لیکن جو قوم اپنی روایات کو فراموش کر دیتی ہے وہ اپنے اجتماعی وجود کی تباہی و بربادی کے اسباب خود فراہم کر لیتی ہے:

قوم روشن از سوادِ سرگزشت   خود شناس آمد زیادِ سرگزشت
سرگزشت او گر از یادش رود   باز اندر نیستی گم می شود [۴۴]

امومت

مسئلہ اموت دنیا کے ہر ادب میں اہمیت حاصل کر رہے۔ اقبال کے نزدیک کسی قوم کی اصل دولت ہیرے جواہرات، سونا اور چاندی نہیں ہوتی بلکہ صحتمند، محنتی اور ذہین افراد ہی اُس کا سرمایۂ حیات ہوتے ہیں:

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر   نیست از نقد و قماش وسیم و زر
مالِ او فرزند ہائے تندرست   تر دماغ وسخت کوش و چاق و چست [۴۵]

اس سے ظاہر ہے کہ امومت کی عزت اور حفاظت ہر ذی شعور ملت پر لازم ہے۔ مغربی مما لک جو کل تک ضبطِ تولید کے قائل تھے آج اس حقیقت کو محسوس کر رہے ہیں اور ان عورتوں کو تعظیم وتکریم، بخشش وانعام کی مستحق قرار دے رہے ہیں جن کے بچے نہ صرف قوی اور صحتمند ہوں بلکہ تعداد میں بھی زیادہ ہوں۔ اقبال کے خیال میں بھی امومت نوع انسانی کے لیے باعثِ رحمت ہے کیونکہ اُس کی نبوت سے نسبت ہے۔ اچھی

اومومت سے قوم کی عمارت پائیدار اور مستقبل روشن ہوتا ہے۔ اُسی سے رفتارِ حیات میں تیزی پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کے دھارے میں وہی متوّج (توجہ) کا سبب بنتی ہے اور اُسی سے اسرارِ حیات کا انکشاف ہوتا ہے:

نیک اگر بینی امومت رحمت است   زانکہ او را بانبوت نسبت است
از امومت پختہ تر تعمیر ما   درخط سیمائے او تقدیر ما
از امومت گرم رفتارِ حیات   از امومت کشف اسرارِ حیات
از امومت پیچ و تاب جوئے ما
موج و گرداب و حباب جوئے ما [۴۶]

اس طرح امومت کی اہمیت کا اندازہ کر کے اقبال اس کے استحکام کی ضرورت کو واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مجموعی حیثیت سے اگر نوع پر نظر ڈالی جائے تو اس کے وہ افراد جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اس کے موجود افراد کے مقابلہ میں شاید زیادہ بدیہی الوجود ہیں۔ موجودہ افراد کی فوری اغراض ان پر قربان کر دی جاتی ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ رفتہ رفتہ ظاہر ہوتے ہیں۔ ملتوں کے لیے سب سے زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ اجتماعی وجود کا تمدنی، اقتصادی یا سیاسی سلسلہ بلا انقطاع کس طرح قائم رکھا جائے۔ فنا اور معدوم ہو جائے کے خیال سے ملتیں بھی اُسی طرح خوفزدہ ہو جاتی ہیں جس طرح کہ افراد۔ کسی قوم کی مختلف عقلی یا غیر عقلی صلاحیتوں کے محاسن کا اندازہ ہمیشہ اسی مقصد سے کیا جانا چاہیے۔ [۴۷]

اقبال کا فلسفۂ بےخودی ایسی صالح جماعتی زندگی کا تصور پیش کرتا ہے جس میں فرد رضا کارانہ طور پر جماعتی مفادات کے لیے اپنی خدمات وقف کر دیتا ہے۔ ایسے معاشرہ کا ہر فرد یہ محسوس کرتا ہے کہ جماعت کی مادی اور اخلاقی تکمیل کے بغیر اس کی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کی فطری صلاحیتوں کو ابھرنے کا کوئی موقع مل سکتا ہے۔۔۔ اس طرح انفرادی حریت اور جماعتی آئین کا ظاہری تضاد رفع ہوتا ہے۔ افراد کے لیے مشترک اساس قائم ہوتی ہے۔ اُن میں روحانی تعلق اور جذباتی ربط پیدا ہوتا ہے۔ یہی جماعتی انا ماضی کی محافظ، مستقبل کی آئینہ دار اور ملت کی بقا کی بہترین ضمانت ہو جاتی ہے:

مایہ دار سیرت دیرینہ او   رفتہ و آئندہ را آئینہ او
وصل استقبال و ماضی ذات او   چوں ابدلا انتہا اوقاتِ او [۴۸]

تیسری دنیا کے موجودہ معاشرتی حالات نے پاکستان کے لیے ایک لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا ہے کیونکہ پاکستان بڑے مہیب معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل سے دوچار ہے۔

جہاں بیک وقت تین سماجی نظام یعنی قبائلی نظام، دیو قامت جاگیرداری نظام اور سرمایہ داری نظام

موجود ہیں جن کا مسلح تحفظ جدید نو آبادیاتی نظام کر رہا ہے۔ پاکستان کی مسلم مذہبی پیشوائیت، دانشور، ماہرین تعلیم اور بیوروکریسی سب نہ صرف معاشی استحصال سے اغماض کرتے ہیں، بل کہ اسے جائز سمجھتے ہیں۔ کئی جارحیت پسند تنظیمیں اُبھر آئی ہیں۔ امیر مال مست ہیں اور غریب حال مست ہیں۔ کسان گمبھیر معاشی اور معاشرتی مسائل میں گھِرے ہیں۔ مزدور طبقہ کو جدید نو آبادیاتی نظام میں سمجھوتہ باز بنا کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کی اکثریت سرُمہ درگلو ہے۔ قیام پاکستان سے اب تک ملک محض سیاست گردی کا شکار ہے اور اس کے معاشی اور معاشرتی مسائل لاینحل معلوم ہوتے ہیں۔

پاکستان علامہ اقبال کی فکر کا نتیجہ ہے۔ جہاں تک پاکستان میں تعمیرِ خودی کی معاشرتی بنیادوں کا سوال ہے موجودہ زہرناک معاشرتی ماحول میں ان کے فلسفۂ خودی اور ان کی تعلیمات کو کسی طرح بھی عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ اقبال نے تعمیرِ خودی کا پیغام دیا۔ لیکن ملک میں نفیٔ خودی کے معروضی حالات پیدا کر دیئے۔ اقبال نے لا الٰہ الاّ اللہ پر عمل پیرا ہوئے کی تلقین کی لیکن ملک کی مذہبی پیشوائیت اور دوسری قیادت نے جدید نو آبادیاتی نظام کے آستانے پر جبیں سائی کی۔ اقبال نے فقرِ غیور کا درس دیا۔ لیکن حکمران طبقوں نے اپنی معاشی استحصال کی پالیسی سے لوگوں میں جاہ و مال کی ہوس اور مہلک معاشرتی قباحتوں کو پھیلا دیا۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشرتی حالات میں اقبال کی نصب العینی تعلیمات لوگوں کی زندگی میں عملی صورت اختیار نہیں کرسکتیں۔ علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے لابدی ہے کہ سب سے پہلے ملک کو جدید نو آبادیاتی نظام کے چنگل سے نکالا جائے۔

یہ ایک المیہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشرتی ماحول میں علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایک طرف استقرائی اور جدلیاتی طریقِ فکر نے معاشرے کو بہتر خطوط پر بدلنے کا راز عام کر دیا ہے اور روحِ عصر نے پرانے کو فنا کے راستے پر اور نئے کو بالیدگی اور ارتقاء کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ زمانے کی نو آفرینی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اس فضا اور اس ماحول سے اقبال کے فلسفہ خودی کے عملی اطلاق اور سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی ظہور کے امکانات پیدا ہوں گے۔

❁...❁...❁

حوالہ جات وحواشی

۱۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، مترجم: سید نذیر نیازی، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۶۱ء۔
۲۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (اُردو)،ص ۲۶۵۔
۳۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی)،ص ۶۵۔
۴۔ ایضاً،ص ۲۷۲۔
۵۔ سید مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، (مکتوب بنام نکلسن) اردو اکادمی، دلّی، ۱۹۹۰ء۔
۶۔ علامہ اقبال، دیپاچہ پیام مشرق، ص ۵۔
۷۔ علامہ اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ خطبہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء، ص ۱۰۔
۸۔ ایضاً،ص ۱۲۔
۹۔ ایضاً،ص ۱۳۔
۱۰۔ ایضاً،ص ۱۵۔
۱۱۔ ایضاً،ص ۲۰۔
۱۲۔ ایضاً،ص ۸۔
۱۳۔ ایضاً،ص ۱۱۔
۱۴۔ ایضاً،ص ۱۳۔
۱۵۔ علامہ اقبال، سالِ نو کا پیغام، یکم جنوری ۱۹۳۸ء، آل انڈیا ریڈیو۔
۱۶۔ سید مظفر حسین برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، (مکتوب بنام خواجہ عبدالرحیم)، اردو اکادمی، دلّی، ۱۹۹۰ء۔
۱۷۔ علامہ اقبال، آل انڈیا مسلم لیگ خطبہ الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء، ص ۱۱۔
۱۸۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۱۰۔
۱۹۔ ایضاً،ص ۱۲۔
۲۰۔ سید سلیمان ندوی، اقبال کا علم الکلام مشمولہ اقبالیات کے سو سال۔ (مرتّبین) سہیل عمر، وحید عشرت، رفیع الدین ہاشمی؛ اقبال اکادمی، لاہور، ۲۰۰۵ء۔
۲۱۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۱۴۔
۲۲۔ ایضاً،ص ۱۵۔
۲۳۔ ایضاً،ص ۱۸۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۰۔
۲۵۔ ایضاً، ص ۲۳۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۲۵۔
۲۷۔ ایضاً، ص ۲۷۔
۲۸۔ علامہ اقبال، دیباچہ رموز بیخودی، ص ۲۔
۲۹۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۳۵۔
۳۰۔ ایضاً، ص ۴۰۔
۳۱۔ ایضاً، ص ۴۲۔
۳۲۔ ایضاً، ص ۴۶۔
۳۳۔ ایضاً، ص ۵۸۔
۳۴۔ ایضاً، ص ۶۱۔
۳۵۔ علامہ اقبال، پیامِ مشرق، ص ۸۰۔
۳۶۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۶۲۔
۳۷۔ ایضاً، ص ۶۳۔
۳۸۔ ایضاً، ص ۶۶۔
۳۹۔ ایضاً، ص ۶۷۔
۴۰۔ ایضاً، ص ۶۹۔
۴۱۔ ایضاً، ص ۷۲۔
۴۲۔ ایضاً، ص ۷۳۔
۴۳۔ ایضاً، ص ۷۳۔
۴۴۔ ایضاً، ص ۷۴۔
۴۵۔ ایضاً، ص ۷۴۔
۴۶۔ ایضاً، ص ۷۴۔
۴۷۔ علامہ اقبال، قومی زندگی، مشمولہ مخزن، ۱۹۰۵۔
۴۸۔ علامہ اقبال، رموز بیخودی، ص ۶۵۔